جمہوری عمل کا نظریہ اور عرب بہار

الفریڈ سٹیفن اور جان جے لنز

خلاصہ:

عرب بہار کے تناظر میں جمہوری عمل کے نظریے کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جو امور اہمیت کے حامل ہیں ان میں جمہوریت اور مذاہب کے مابین تعلق، جمہوری اور آمرانہ نظامِ حکومتوں کے ملغوبے کا کردار، بادشاہت اور جمہوریت کی جانب سفر میں اس کے اثرات شامل ہیں۔ چنانچہ اس مضمون میں بنیادی طور پر انہی موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ مذہب اور جمہوریت کے حوالے سے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ دونوں کو کس چیز کی ضرورت ہے اور کس کی نہیں تاکہ یہ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء نہ ہوں۔ حالیہ عرب بہار نے کئی عرب ممالک میں آمریت کے جزوی خاتمے اور جمہوریت کی جانب سفر شروع کرتے ہوئے ملغوبہ صورتِ حال کو جنم دیا ہے اور عین ممکن ہے کہ یہ صورتِ حال بہت طویل نہ ہو۔ سلطانیت - جو کسی نہ کسی درجے میں ہر عرب ملک کا خاصہ رہی ہے، کیونکہ عرب دنیا بنیادی طور پر غیر جمہوری ہے- بھی اپنا دامن سمیٹ رہی ہے اور عرب بہار کے واقعات نے آمریت کی بساط لپیٹنے اور عام شہریوں کو اپنی عظمت کا احساس دلانے کا اہم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

''فردِ واحد کے اقتداری نظام میں تبدیلی: جمہوریت کے لیے مواقع'' نامی کتاب کی اشاعت کو ۲۵ سے زیادہ سال گزر چکے ہیں اس کتاب نے جمہوری عمل کے نظریے کو فروغ دیا۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ جمہوری عمل سے متعلق اس پرانی کتاب میں کون سی چیزیں قابلِ عمل ہیں اور کن نظریات کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے؟ خاص طور پر عرب دنیا میں ہونے والے موجودہ اتار چڑھاؤ کی روشنی میں کن

نئے تناظرات کی ضرورت ہے؟

یہاں عرب بہار کی روشنی میں نمایاں ہونے والے تین موضوعات پر بحث کی جائے گی:

۱۔ جمہوریت اور مذہب کے مابین تعلق (خاص طور پر دنیا کے مسلم اکثریتی ممالک میں)۔

۲۔ ملغوبہ (Hybrid) حکومتوں کا کردار جس میں فردِ واحد کے اقتدار کے اور جمہوری عناصر شامل ہوں۔

۳۔ باشاہت (Sultanism) کی نوعیت اور جمہوریت میں تبدیلی کے لیے اس کے اثرات۔

مذہب یا مذاہب کے مابین کشمکش نے جمہوری تبدیلی کی تیسری لہر کی کامیابی یا ناکامی میں قابلِ ذکر کردار ادا نہیں کیا۔ اگرچہ پولینڈ، چلی اور برازیل میں جمہوری تبدیلی کے عمل میں رومن کیتھولک چرچ نے ایک اہم اور مثبت کردار ادا کیا لیکن یورپ کی پرانی تاریخ کے برعکس مذہب کا کردار بنیادی نہیں تھا، لیکن عرب دنیا کی سول سوسائٹی اور خاص طور پر وہاں کے دیہی علاقوں میں مذہبی طاقتوں کا کردار بہت مضبوط ہے چنانچہ جمہوری عمل کا مطالعہ کرنے والے طالب علموں کے لیے، عرب بہار میں اسلام کا مرکزی کردار، ایک بالکل نیا پہلو سامنے لایا ہے اور ضرورت پیدا کی ہے کہ نئے نظریات اور اعداد و شمار کی روشنی میں اس کا تجزیہ کیا جائے۔

سیموئیل-پی-ہنٹنگٹن نے یہ رائے دی تھی (اگرچہ اس پر اختلاف ہوتا رہا ہے) کہ مذہب اور خصوصاً اسلام جمہوری عمل کے بڑھنے میں بڑی رکاوٹ بنے گا۔ چنانچہ الفریڈ سٹیفن نے اس خیال کے تحت یہ جاننے کی کوشش کی کہ مذہب اور جمہوریت دونوں کو کس چیز کی ضرورت ہے اور کس کی نہیں تاکہ یہ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء نہ ہوں۔[۱] اس کا خیال تھا کہ نہ تو مذہب کی مخالفت (Laicite) اور نہ سیکولرازم (ریاست اور مذہب کی تفریق) اس کا حل ہے بلکہ مذہب اور ریاست کے مابین واضح طور پر آئینی حدود قائم کر دینی چاہییں۔ اس نے اس حد بندی کو ''جڑواں برداشت'' یا ''دوطرفہ برداشت'' (Twin Toleration) کا نام دیا۔ اگر کسی ملک میں دوطرفہ برداشت کام کر رہی ہو تو مذہب آئین کے مطابق کام کرنے والے جمہوری نمائندوں کو نہیں چھیڑتا اور جب تک مذہبی

لوگ دوسرے شہریوں کے حقوق کا احترام کرتے رہیں، جمہوری نمائندے انہیں تنگ نہیں کرتے۔

یہ اصطلاح یورپی یونین کی جمہوریتوں پر بھی صادق آتی ہے۔ انقلاب فرانس کی وجہ سے، فرانس میں بہت حد تک مذہب کے لیے غیر دوستانہ فضا ہے جبکہ اس کے برعکس جرمنی، آسٹریا، بلجیئم، نیدرلینڈ اور سوئٹزرلینڈ میں صورت حال بالکل مختلف ہے۔ بلکہ جرمنی کی حکومت تو رومن کیتھولک اور Lutheran چرچ کے لیے چندہ بھی جمع کرتی ہے۔ یورپ میں مذہبی برداشت اور جمہوریت کے ساتھ، سیکولرازم کی تمام اقسام بھی موجود ہیں۔۲

اہم نکتہ یہ ہے کہ سیکولرازم کی متعدد شکلیں جمہوریت کے ساتھ دوستانہ تعلق رکھتی ہیں اور یہ دونوں برداشت کے ساتھ دوستانہ ماحول میں قائم رہ سکتی ہیں، ضرورت ہے کہ خاص طور پر عرب دنیا میں اسے عام کیا جائے اور اس حقیقت کو بھی عام کرنے کی ضرورت ہے کہ البانیہ، انڈونیشیا، سینی گال اور ترکی کے مسلم اکثریتی ممالک میں تقریباً ۳۰۰ ملین مسلمان جمہوریت کے تحت ہی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور اگر اس میں ہندو اکثریت کے ملک ہندوستان میں رہنے والے ۱۷۸ ملین مسلمانوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو مغرب سے باہر جمہوریت میں زندگی گزارنے والے مسلمانوں کی تعداد نصف بلین تک جا پہنچتی ہے۔ ہندوستان کا تجربہ خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہوگا کیونکہ وہ ایک ایسی جمہوریت ہے جو چھ عشروں سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ یہ اس مفروضے کے خلاف بھی شہادت ہے کہ جمہوریت کی جانب مسلمانوں کا رویہ غیر معمولی ہے۔ حال ہی میں ہونے والے ایک سروے میں ۷۱ فی صد مسلمانوں اور ہندوؤں نے یکساں طور پر جمہوریت کی حمایت کی۔۳ جبکہ اس کے قریب ہی غالب مسلم اکثریتی مسلمان ملک پاکستان میں یہ تعداد ۳۴ فی صد ہے۔ مسلم دنیا کی ابھرتی ہوئی نئی جمہوریتوں انڈونیشیا اور سینی گال کو دیکھتے ہوئے ہمیں یہ سوال کرنا چاہیے کہ کیا اسلامی سیاسی نظریے میں کسی نئی چیز پر زور دیا گیا ہے جس نے ان جگہوں پر جمہوری عمل کی حمایت کی ہے اور کیا جمہوریت کے پروان چڑھنے میں نئی عوامی پالیسیاں دوطرفہ برداشت کے لیے دوستانہ رہی ہیں؟

نظریاتی اور عملی اعتبار سے ہمیں اس قرآنی آیت پر مسلسل زور نظر آتا ہے ''اسلام میں کوئی جبر نہیں''۔ جیسا کہ سول سوسائٹی کے رہنما، سیاست دان اور سیاسی سائنس دان امین رئیس کا کہنا ہے کہ ''قرآن اسلامی ریاست کے قیام، یا شریعت کے نفاذ اور اسلامی ریاست کا قیام، مسلمانوں کی ذمہ داری ہونے کے حوالے سے کچھ نہیں کہتا''۔[۴] انڈونیشیا کے مسلمان رہنما اپنے ملک میں شریعت کا نفاذ روکنے کے لیے اکثر اس طرح کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ آج تک مسلمان اکثریت جمہوریتوں میں شریعت کو قانون اور اسلام کو اس کا مسلمہ مذہب نہیں بنایا گیا۔[۵]

تیونس بھی ایسی ہی ایک مثال ہے جو ۲۰۱۲ء میں پہلا عرب ملک بنا جس نے ۷ نکاتی فریڈم ہاؤس سکیل میں تیسرا نمبر حاصل کیا۔ بہت سے پان عرب (Pan Arab) اور اسلام پسند جو عالمی اسلامی خلافت کی حمایت کرتے ہیں، انفرادی ریاستوں میں جمہوریت کے جواز پر سوال اٹھاتے ہیں، تاہم انڈونیشیا کی طرح، تیونس میں بھی، جمہوریت کی حمایت کرنے والے بااثر مسلم رہنماؤں نے اتفاقِ رائے، مشاورت اور عدل کے قرآنی نظریات کو استعمال کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر کسی خاص ملک میں جمہوریت وہاں کے شہریوں کی تاریخ کی خصوصیات سے رابطہ بنا سکتی ہے تو جمہوریت وہاں سب سے زیادہ مؤثر اور قانونی طرزِ حکومت ہوگی۔ مثلاً تیونس کی ۲۰۱۱ء سے سب سے بڑی اسلامی حکمران پارٹی انتفاضہ کے سربراہ راشد غنوشی نے کہا ہے کہ ان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ عرب دنیا میں سب سے زیادہ ترقی پسند اور خواتین دوست عائلی قوانین تیونس کے ہاں ہیں۔[۶]

ایک اور تصور جو تیونس میں زور پکڑ رہا ہے وہ سیکولرازم نہیں ہے بلکہ سول سٹیٹ (عوامی ریاست) یا الدولة المدنية کا تصور ہے۔ عوامی ریاست میں مذہب، جمہوری روایات کی عزت کرتا ہے لوگ خودمختار ہوتے ہیں اور وہ اپنا قانون بناتے ہیں۔ لیکن عوامی ریاست بھی مذہبی روایات اور عوامی سطح پر اس کے جائز کردار کی عزت کرتی ہے۔

وہ کون سی عوامی پالیسیاں اور کارنامے ہیں جن کی وجہ سے انڈونیشیا، سینی گال اور انڈیا میں مذہب اور جمہوریت کے مابین باہمی احترام کا رشتہ پروان چڑھا ہے؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ مغربی یورپ کی نسبت یہ تینوں ممالک دوسرے مذاہب کے تہواروں کا زیادہ دھیان رکھتے ہیں۔ مثلاً ڈنمارک، فرانس، جرمنی، نیدرلینڈ، سویڈن اور سوئٹزرلینڈ میں کُل ملا کر ۷۶ مذہبی چھٹیاں ہوتی ہیں جن میں چھٹی کے باوجود معاوضہ دیا جاتا ہے لیکن یہ سب کی سب عیسائی کیلنڈر کے تحت ہوتی ہیں ان میں ایک بھی چھٹی اقلیتی مذاہب کے لیے نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس انڈونیشیا میں ۶ سرکاری اسلامی چھٹیاں ہوتی ہیں اور سات چھٹیاں اقلیتوں کے تہواروں یا مقدس دنوں کے احترام میں کی جاتی ہیں۔ سینی گال میں سات اسلامی چھٹیاں اور ۶ چھٹیاں دس نسبت ایک سے بھی کم تناسب والی آبادی یعنی رومن کیتھولک کے لیے ہوتی ہیں۔ یہ ملک اپنے کیتھولک شہریوں کے روم (مذہبی سفر پر) جانے کے لیے ان کی امداد بھی کرتا ہے۔ ہندوستان میں ۵ سرکاری ہندو چھٹیاں اور دس چھٹیاں دیگر تمام اقلیتی مذاہب کے لیے مخصوص ہیں۔ اس کے علاوہ یہ تینوں ملک مختلف مذاہب کو چندہ بھی دیتے ہیں خاص طور پر مذہبی سکولوں اور ہسپتالوں کے لیے۔

انڈیا، انڈونیشیا اور سینی گال میں ریاست اور مذہب کے مابین پالیسی میں تعاون، پالیسی پر اتفاقِ رائے - فرانسیسی قسم کی مذہب مخالف یا امریکہ کی مذہب و ریاست تعاون کے نظریے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ انڈونیشیا اور سینی گال میں وزارتِ تعلیم اور اسلامی نظریاتی لوگوں نے باہم مشاورت سے متفقہ نصاب، ان کے معیار کو جانچنے کے طریقہ کار اور مذہب کی تاریخ اور تاریخِ اسلام کے نصاب کو ترتیب دیا ہے جس کا خوشگوار نتیجہ یہ ہے کہ ہمیشہ سے کہیں زیادہ بڑھ کر لوگ اپنے بچوں کو سکول بھیج رہے ہیں۔ ۱۱ سے ۱۴ سال کی عمر کے انڈونیشین بچوں میں ۹۶ فی صد لڑکے اور ۹۵ فی صد لڑکیاں پڑھی لکھی ہیں۔

ایسی مثالیں جان رال کی اس نصیحت پر کہ مذہب کو ''سیاسی ایجنڈے'' سے دور رکھنا چاہیے تاکہ یہ حد سے زیادہ ''اخلاقی اتفاقِ رائے'' جو کہ جمہوریت کا تقاضا ہے میں مداخلت نہ کرے، سوال اٹھا دیتی ہیں۔ اگر جمہوریت کو سمونے کے مذہبی دلائل پہلے ہی دیے جا رہے ہیں تو مسلم رہنماؤں کو زیادہ آگے بڑھ کر یہ بات کرنی چاہیے کہ دراصل اسلام اور جمہوریت ایک دوسرے کے ساتھ قابلِ عمل

ہیں۔ مزید برآں، کیا یہ اچھی بات نہ ہوگی کہ عرب دنیا کے لوگ یہ جان لیں جو سیکولرازم کو مذہب کا شدید مخالف سمجھتے ہیں، کہ انڈونیشیا اور سینی گال نے مذہب، ریاست اور معاشرے کے مابین ایسا تعلق بنا دیا ہے جو اسلام اور جمہوریت دونوں کے لیے دوستانہ ہے۔

ملغوبہ طرزِ حکومت: مصر کا معاملہ

طرزِ حکومتوں کی مختلف شکلوں مثلاً جمہوریت، آمریت، مطلق العنانی، مابعد مطلق العنانی اور بادشاہت کے علاوہ ہم اس میں ایک اور قسم کا اضافہ کرتے ہیں وہ ہے ''جمہوریت اور آمریت کا ملغوبہ'' (Authoritarian-Democratic Hybrid)۔

کسی بھی عرب ملک خواہ شام، مصر، لیبیا یا تیونس نے نہ تو مکمل طور پر مطلق العنان حکومت (جیسا کہ اس کی اصل تعریف کی جاتی ہے) کا تجربہ کیا ہے اور نہ ہی جمہوریت کا۔ چنانچہ اسے جمہوریت اور آمریت کے ملغوبے کا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ نام ہی ظاہر کر دیتا ہے کہ ملک میں غیر معمولی صورتِ حال ہے۔ بہت سے مواقع پر وہاں کے بڑے کھلاڑی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ جمہوریت کی بعض روایات کا پاس کرنے میں ناکام رہے (مثلاً الیکشن کرانا) تو وہ اپنا جواز اور حمایتیوں کی حمایت کھو بیٹھیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ چیزوں پر اپنا آمرانہ اقتدار بھی رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے مقاصد کو آگے بڑھا سکیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ہم اسے ''طرزِ حکومت'' کہنا ختم کر دیں کیونکہ یہ بہت طویل المیعاد نہیں ہو سکتا۔ طرزِ حکومت کی بجائے ''صورتِ حال'' (Situation) کی اصطلاح ایک بہتر لفظ ہوگا۔

عین ممکن ہے کہ موجودہ صورتِ حال میں بہت سے عرب ممالک میں بھی یہ ملغوبہ 'نظامِ حکومت' کی بجائے 'صورتِ حال' بن جائے۔ زیادہ امکان تو اس بات کا ہوتا ہے کہ یہ صورتِ حال جمہوریت میں بدل جائے لیکن ایسی صورتِ حال بھی ہو سکتی ہے کہ فوجی مداخلت یا کسی دوسرے ذریعے سے یہ مکمل آمریت بن جائے۔

سوال یہ ہے کہ ایسی ملغوبہ صورتِ حال (اگر اسے نظامِ حکومت نہ بھی کہا جائے) وجود میں کیوں آتی ہے؟ ماضی قریب میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات مثلاً کمیونزم کا زوال، دس سابقہ کمیونسٹ ریاستوں کی یورپین یونین میں شمولیت، لاطینی امریکہ میں فوجی حکومت کا خاتمہ اور تحریر اسکوائر میں اٹھائی جانے والی آرزوئیں ___ ان سب کا مطلب 'تاریخ کا خاتمہ' اور مکمل جمہوریت کی حکومت نہیں ہے، لیکن مصر جیسے ممالک میں فرد کے احترام کے تصور میں اضافہ ہوا ہے اور لوگوں نے خود کو محض عوام کی نسبت، شہری سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ اب اس دنیا میں ایک کے بعد دوسرے جنرل، جو پچھلے ساٹھ سالوں سے ہوتا آیا ہے ___ کی گنجائش نہیں رہی۔

تاہم جنرلز، اخوان المسلمون اور لبرلز سب کے سب، کسی نہ کسی حوالے سے خود کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں تاکہ پبلک پالیسی بنانے کے حوالے سے جمہوری اداروں کے حقوق کی کچھ حد بندی کی جا سکے۔ حسنی مبارک کے اقتدار کے خاتمے کے بعد بہت سے نوجوان سیکولر لبرلز، جنہوں نے تحریر اسکوائر کو بھر دیا تھا- نے محسوس کیا کہ اخوان المسلمون اس قدر مضبوط اور غیر جمہوری ہے کہ ضروری لبرل اور جمہوری اقدار کو بچانے کے لیے غیر جمہوری طاقت کے ذریعے یعنی فوج سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ بہت سے لبرلز کا خیال ہے کہ فوج کو دستوری اسمبلی کے لیے انتخابات سے قبل ایک ڈھانچہ بنانا چاہیے یا کم از کم دستور تحریر کرنا چاہیے یا کم از کم ماہرین کی ایک کمیٹی بنانی چاہیے جو آئین کا مسودہ تیار کرے تاکہ اخوان المسلمون اکثریت حاصل نہ کر سکے۔

دوسری جانب سپریم کونسل آف دی آرمڈ فورسز (SCAF) الیکشن کے انعقاد اور اس کے نتیجے میں اسلام پسندوں کے برسرِ اقتدار آنے کی صورت میں ان پر کنٹرول رکھنے کے لیے کچھ اقدامات پر راضی ہوگئی۔ ۲۶ نومبر ۲۰۱۱ء کو ہونے والے پارلیمانی انتخابات سے چند ہفتے قبل انہوں نے بدنام زمانہ ''سلمی ڈاکیومنٹ (Silmi document)'' کو جاری کیا جس میں بہت سی ایسی چیزیں شامل تھیں جو صرف فوج کے ساتھ یا فوجی اقتدار کے ساتھ مخصوص ہیں اور کسی جمہوریت میں ان کا وجود تک نہیں۔ جیسے اس کی نویں شق میں کہا گیا کہ صرف SCAF فوج اور اس سے متعلقہ تمام معاملات مثلاً

اس کے بجٹ پر بحث ومباحثے کی واحد ذمہ دار ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

جبکہ اخوان المسلمون نے بھانپ لیا کہ وہ سیکولرلبرلز کا نشانہ بننے والے ہیں چنانچہ انہوں نے فوج کے ساتھ سمجھوتہ شروع کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے حسنی مبارک کے استعفیٰ سے متعلق استصواب رائے (Referendum) کی حمایت کی۔ علاوہ ازیں، پچھلے تین ماہ میں وہ پولیس اور فوج کی بہت سی کاروائیوں پر خاموش رہے۔ ان کاروائیوں میں پولیس اور فوج نے احتجاج کرنے والے کم از کم ۲۸ قبطی عیسائیوں کو مار ڈالا۔ اس کے بدلے میں اخوان کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ محدود جمہوریت کی جزوی قیادت کر سکیں۔

جتنا کچھ عام طور پر سمجھا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ اخوان نے اس حکومت کو حاصل کرنے کی قیمت ادا کی (اخوان نے تو صرف مصر کی صدارت حاصل کی) اس کے بدلے میں آئین، معیشت اور خطے کی حکومت میں فوج کی خصوصی اہمیت بھی شامل ہے، نیا دستور جو زیادہ تر اخوان کا بنایا ہوا ہے، بہت سے ایسے انتظامات کی سفارش کرتا ہے جو عام طور پر جمہوریت کا حصہ نہیں ہوتے۔ مثلاً یہ سفارش کہ وزیرِ دفاع کو لازماً حاضر سروس فوجی افسر ہونا چاہیے۔ نیشنل ڈیفنس کونسل ۸ باوردی اور ۷ عام یا غیر فوجی ملازمین پر مشتمل ہو۔ اس کے علاوہ عام افراد جو ''مسلح افواج کو نقصان پہنچائیں'' کو فوجی عدالتوں میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

صدر محمد مرسی کے بعض اہم جرنیلوں کو ملازمت سے برطرف کرنے کے فیصلے پر تو بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن بہت سارے فوجی افسروں کو بہترین معاشی عہدوں مثلاً نہر سوئز کی نگرانی، غیر فوجی ہوابازی (Civil Aviation) اور فوج کے ماتحت چلائی جانے والی بڑی بڑی فیکٹریاں وغیرہ کے لیے نامزد کرنا جس کے ذریعے سے وہ فوج کو معاشی طور مزید مضبوط کر سکتے ہیں وہ فوج جو مصری معیشت پر پہلے ہی بڑا اثر ورسوخ رکھتی ہے۔ انڈونیشیا کے برعکس جہاں خطے کی حکومت کے لیے انتخاب ہوتا ہے، مصر میں بہت سے ریٹائرڈ فوجی افسران زیادہ تر مضبوط علاقائی نشستوں پر براجمان ہیں۔ فوجی اور جمہوری حکومت کے ملغوبے کا نظام جس ملک میں ہو وہاں کے طور طریقے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

تیونس میں کیا مختلف تھا؟

مصر کے برعکس، آمریت کے بعد کے تیونس نے، فروری ۲۰۱۳ء کے غیر مستحکم کرنے والے قتل عام کے باوجود خود کو اب تک اس مرکب یا ملغوبے سے بچائے رکھا جس سے ایک ملغوبہ (Hybrid) صورتِ حال یا حکومت کا ظہور ہوتا ہے۔ اس کی تین وجوہات تھیں:

اول: انتفاضہ پارٹی کے رہنما ایک وقت میں اخوان المسلمون کے قریب تھے جب انڈونیشیا کی بڑی اسلامی پارٹیوں کی طرح وہ جمہوریت کے نہ صرف جواز بلکہ اس کے لازم ہونے کے قائل تھے۔ اس چیز نے لبرلز اور انتفاضہ پارٹی کے رہنماؤں کو بن علی کے خلاف متحد کر دیا۔

دوم: لادینوں اور اسلام پسندوں کے مابین تبدیلی کا عمل (جمہوری تبدیلی) شروع ہونے سے قبل انتہائی جدید 'معاہدوں' کی صورت میں جمہوریت کے نتائج جو آمریت کے مرکب کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، کا خوف دلوں میں بٹھایا گیا۔ تیونس کے دونوں سابق سیکولر صدور حبیب بورگیبا اور بن علی نے جان بوجھ کر اس خوف کو ہوا دی۔ انہوں نے بار بار یہ دعویٰ کیا کہ اسلام پسندوں کی کامیابی کی صورت میں داخلی امن، عورتوں کے حقوق اور سیکولر لبرلز مشکل میں آ جائیں گے اور یہ کہ انتہائی بدترین شکل میں وہ دہشت گرد ثابت ہوں گے۔ تیونس کے عوام نے اس قسم کی بے تحاشہ باتیں سنیں لیکن وہاں چوٹی کے سیکولر لبرلز نے محسوس کیا کہ وہ بن علی کی نسبت اسلام پسندوں کے ساتھ زیادہ آسانی اور کامیابی سے کام کر سکتے ہیں۔ یقیناً ابھی بھی شبہات موجود ہیں لیکن لادین آزاد خیالوں کی اکثریت انتفاضہ سے اتنی خوفزدہ نہیں تھی کہ وہ ان کے خلاف آمریت کو بطور ڈھال استعمال کرتے۔

سوم: مصر کے برعکس تیونس میں نہ صرف سول سوسائٹی بلکہ سیاسی معاشرے نے بھی ترقی کرنا شروع کی۔ سول سوسائٹی کسی آمرانہ حکومت کی تباہی میں انتہائی اہم کردار ادا کر سکتی ہے لیکن جمہوریت کی تعمیر کے لیے سیاسی معاشرت کی ضرورت پڑتی ہے۔

اگرچہ تیونس کے مقابلے میں مصر کی سول سوسائٹی کے زیادہ تخلیقی ہونے سے متعلق بحث کی گنجائش موجود ہے۔ حسنی مبارک کی فروری ۲۰۱۱ء میں بے دخلی کے تقریباً چار ماہ بعد تک دو اہم سماجی

گروہوں اخوان المسلمون اور سیکولر لبرلز نے ایک بھی ایسا مشترکہ اجلاس نہیں بلایا جس میں وہ جمہوری حکومت کے متبادل نظام کو زیر بحث لاتے۔

تیونس میں سیکولر لبرلز اور اسلام پسندوں نے بن علی کے اقتدار کے خاتمے سے آٹھ برس قبل باقاعدہ اجلاس منعقد کرنے شروع کیے تاکہ وہ یہ دیکھ سکیں کہ وہ اپنے باہمی خوف کو کس طرح کم کر سکتے ہیں اور جمہوری حکمرانی کے اصولوں پر کس طرح متفق ہو سکتے ہیں، انہوں نے یہ سب ایک سیاسی معاشرے کے قیام کے لیے کیا۔ بن علی کے بعد تیونس کے سیاسی معاشرے کو یقیناً لاتعداد مسائل کے خلاف جدوجہد کرنی پڑی لیکن پوری قابلیت کے ساتھ ایسا کیا گیا تاکہ ۲۰۱۲ء کا تیونس ۳۷ سالوں کے دوران ایک ایسے پہلے عرب اکثریتی ملک کے طور پر سامنے آئے جس کا سیاسی حقوق کا سکور فریڈم ہاؤس میں تین سے زیادہ ہو۔

امید افزا رجحانات اور پریشان کن حقائق

جمہوریت کی طرف منتقلی ہمیشہ غیر یقینی صورتِ حال سے بھرپور ہوتی ہے۔ تیونس بھی اس سے مبرا نہیں ہے۔ یہاں بھی پریشان کن اور بعض یقینی رجحانات پائے گئے۔ الفرڈ سٹیفن کے نومبر ۲۰۱۲ء کے تحقیقی دورے (۲۰۱۱ء سے ان کا چوتھا دورہ) کے دوران یہاں مشاہدہ کیے گئے یقینی رجحانات میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔ بڑی جماعتوں کے صدور کی یہ توقع کہ بے شمار سمجھوتوں کے بعد لکھے جانے والا آئین اور اس کے نتیجے میں قائم ہونے والی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت اکٹھی کرنا۔

۲۔ آئین کی منظوری کے آٹھ ماہ کے اندر انتخابات کا انعقاد۔

۳۔ حکومتی اتحاد اور اپوزیشن دونوں کا مطالبہ ہے کہ اگر انقاضہ انتخابات کے نتیجے میں ایک اور اتحادی اکثریت کے قابل نہ ہوئی تو وہ پُر امن طور پر اقتدار چھوڑ دے گی اور شاید کسی نئے حکومتی اتحاد میں چھوٹے پارٹنر کے طور پر شریک ہو۔

۴۔ منتظم اعلیٰ کے اختیارات کے حل طلب مسئلہ انتفاضہ نے برطانوی طرز کے نظام پارلیمان کو ترجیح دی اور دیگر جماعتوں کا خیال تھا کہ لوگوں کو صدر کے انتخاب میں کردار ادا کرنے کا حق ہونا چاہیے۔

لیکن تیونس میں کچھ تلخ حقائق بھی موجود تھے جنہوں نے بن علی کی حکومت کے خاتمے کے بعد سے اب تک جمہوریت کے لیے بہت مشکلات پیدا کیں۔

۱۔ انتفاضہ کو صرف اسی وقت قانونی حیثیت حاصل ہوگی جب اقتدار کی منتقلی کا عمل شروع ہو چکا ہو۔ انتفاضہ میں جمہوریت پسند سوچ پروان چڑھ رہی تھی لیکن اس کے قائدین کی اکثریت لندن اور پیرس میں جلاوطن تھی۔ مزید یہ کہ سخت گیر لادین آمر بورقیبہ اور بن علی نے تیونس میں اسلامی تعلیم کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا جس سے ایک ایسا خلا پیدا ہوا جسے جدید مذہبی آزادی کے نئے حالات میں پورا کرنے کے لیے وہ انتہا پسند سامنے آئے جن کی خلیجی ممالک مالی مدد کر رہے تھے۔ بدقسمتی سے انتفاضہ ابھی تک اس قابل نہیں ہوئی کہ وہ اہم مساجد اور ان کے قرب وجوار میں متبادل جگہ پیدا کر سکے۔

۲۔ پولیس کی سازش اور نااہلی کی وجہ سے چودہ ستمبر ۲۰۱۲ء میں ہلکے ہتھیاروں سے لیس تقریباً ایک ہزار سلفی قدامت پسندوں نے تیونس میں امریکی سفارتخانے کے بیرونی احاطے پر تقریباً تین گھنٹے تک قبضہ کیے رکھا۔ اس کے بعد سکیورٹی فورسز نے انہیں پیچھے دھکیلا۔ یہ اور اس جیسے دیگر واقعات نے آزاد خیالوں اور لادین حلقوں کی جانب سے انتفاضہ کے وزیر داخلہ اور دفاع پر تنقید میں شدت کو جنم دیا۔ جسے انہوں نے اسلام پسند پیراملٹری لیگ کی طرف سے انقلاب کے دفاع کی خاطر حکومت مخالف لادین مظاہرین پر پُرجوش حملوں سے تعبیر کیا۔

۳۔ بیجی سائد السبسی (Beji Caid Essebsi) جو ایک عمر رسیدہ اور کرشماتی سیاستدان تصور کیے جاتے ہیں اور جنہیں دولت مند بن علی کے وفاداروں اور اتحاد مخالف لادینوں کی حمایت حاصل تھی، نے ۲۳ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو ایک ریلی نکال کر اعلان کیا کہ حکومت اپنا جواز کھو بیٹھی ہے کیونکہ یہ ۲۳ اکتوبر ۲۰۱۱ء کے انتخابات کے بعد آئین کو ایک سال کے اندر مکمل کرنے کا وعدہ پورا نہیں کر سکی۔

السیسی نے حکومت کے لیے نئے مینڈیٹ کی کال دی۔

۴۔ یہ بڑھتا ہوا بحران اس وقت شدت اختیار کر گیا جب حکومت کے ایک معروف نقاد چوکری بیلائد (Chokri Belaid) جمہوری تیونس کے پہلے مقتول سیاسی کارکن بن گئے۔ اس قتل کے نتیجے میں انتفاضہ کے وزیراعظم حمادی جبالی نے ایک ایسی تحریک شروع کی جس کا مقصد ایسی حکومت کا قیام تھا جو کہ مکمل طور غیر حامی ٹیکنو کریٹس پر مشتمل ہو لیکن اس کی اپنی جماعت اس کے ساتھ نہیں چل پائی اور انہوں نے ۱۹ فروری کو استعفیٰ دے دیا۔ اگرچہ مارچ میں انتفاضہ کابینہ کے وزیر دفاع، انصاف، خارجہ امور اور داخلہ سے متعلق عہدوں سے غیر حامی ٹیکنو کریٹس کے حق میں دستبردار ہو گئی ..... جو کہ نام نہاد وزارتیں کہلاتی تھیں۔ نئی کابینہ نے ۱۳ مارچ کو اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔

سلطانیت کی مختلف اقسام

ہمارے جائزے کا تیسرا حصہ سلطانیت کے تصور سے متعلق ہے۔ میکس ویبر کے مطابق آمرانہ طرزِ حکومت (Patrimonialism) اور انتہائی صورت میں سلطان ازم (Sultanism) اس وقت ابھرتا ہے جب غلبہ ایک انتظامی اور عسکری قوت کو جنم دیتا ہے جو کہ آقاؤں کے خالصتاً ذاتی ہتھیار ہیں۔ اس کا مطلب ہوا کہ سلطان ازم کی انتہائی صورتوں میں ریاست کے معاملات کی کوئی خودمختاری نہیں رہتی۔ تمام حکام حتیٰ کہ جنرلز اور ایڈمرلز بھی سلطان کے ''گھریلو عملے'' کے طور پر اچھی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۶۱ء کے دوران ڈومینین جمہوریہ کے آمر حکمران رافیل ٹروجیلو نے اس وقت اپنے بیٹے کو بریگیڈیئر جنرل بنایا جب وہ ابھی نو سال کا بچہ تھا۔ ۷ یہی سلطان ازم ہے۔ اس کے برعکس چلی کا جنرل آگسٹو پینوچٹ کبھی بھی ایسی کوئی چیز نہیں کر پایا کیونکہ چلی کی فوج کے پاس ادارتی شکل میں منظم خودمختاری کی ایسی ڈگری تھی جو اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے پاتی۔ پینوچٹ نے شاید فوج کی ''قیادت بطور حکومت'' کی لیکن ''فوج بطور ادارہ'' کی اپنے ذاتی خیالات اور تنظیمی خودمختاری کی حیثیت قائم رہی۔ ۸

اپنی خصوصیات کے اعتبار سے حکومتیں تقریباً مکمل یا جزوی طور پر سلطانی ہو سکتی ہیں لیکن ان میں

زیادہ تر سلطانی خصوصیات کی حامل نہیں ہوتیں۔ سلطان ازم کو تسلسل کے زاویے سے دیکھنا مفید ہوگا۔

اگر کوئی حکومت خالص سلطان ازم کے قریب ہو تو نسبتاً ایک پُرامن اور داخلی طور پر تخلیق کردہ حکومت ''چار کھلاڑیوں کے روایتی کھیل'' کے ذریعے جمہوری بنانے کے نظریے کے تحت تبدیلی ہونا عملاً ناممکن ہے۔ اگرچہ پُرامن ''معاہدانی'' انتقال اقتدار کو راستہ دینے کے لیے سلطانی حکومت کا امکان آمرانہ حکومت کے مقابلے میں بہت کم ہوتا ہے۔ سلطان کی موجودگی مذاکرات کو بہت مشکل بنا دیتی ہے۔

عرب دنیا بنیادی طور پر غیر جمہوری ہے لیکن اس کی غیر جمہوری حکومتوں میں سے کوئی بھی اس طرح سلطانی نہیں جس طرح کہ Trujillo کی حکومت تھی۔ اس نے ڈومینین معیشت کو اپنی ذاتی جائیداد سمجھا، خاندانی جانشینی کے احکام جاری کیے اور فوج کی طرف سے کسی مربوط مخالفت کا سامنا نہیں کیا۔ ۲۰۱۱ء میں عرب دنیا میں اتار چڑھاؤ سے پہلے لیبیا، شام، یمن، مصر اور تیونس - ان تمام ممالک میں (کم وبیش) سلطان ازم کی کچھ خصوصیات پائی جاتی تھیں۔

قذافی کا لیبیا سب سے زیادہ سلطانی تھا جس نے کبھی ''چار کھلاڑیوں والا کھیل'' نہیں دیکھا۔ قذافی نے سلسلہ کمان اور سلامتی کے ڈھانچے کو اپنی مرضی سے تخلیق، ختم اور دوبارہ تخلیق کیا۔ اس کے بیٹے ممکنہ خاندانی جانشینوں کے طور پر اُبھر رہے تھے، سلامتی سے متعلق اہم عہدے رشتہ داروں کے پاس تھے چند کاروباری گروہ متعلقہ سیاسی خودمختاری حاصل کر سکتے تھے اس کا نتیجہ خانہ جنگی اور اقوام متحدہ کی حمایت یافتہ ناٹو بمباری مہم کی صورت میں باغیوں کے لیے بہت بڑی مدد کی صورت میں آیا تاکہ ''رہنما بھائی'' کی حکومت گرا دی جائے۔ ویبر نے درست کہا کہ ''ریاست ایک انسانی معاشرہ ہے جو (کامیابی سے) کسی متعین علاقہ میں طاقت کے جائز استعمال پر اجارہ داری کا دعویٰ کرتا ہے''۔[۹] لیبیا میں ایک قابل عمل جمہوری ریاست کے قیام سے قبل ایک طویل عرصہ درکار ہوگا۔

کسی قابل استعمال ریاست کی دوبارہ تعمیر اور سلامتی سے متعلق مربوط نظام کا قیام لیبیا کی عبوری حکومت اور جمہوریت کے بین الاقوامی فروغ کاروں کی مشترکہ ذمہ داری ہونی چاہیے تھی۔

جیسا کہ توقع تھی انتخابات تیزی اور مناسب آسانی کے ساتھ ہو گئے لیکن ۱۱ ستمبر ۲۰۱۲ء کو ایک یا ایک سے زائد ملیشیا (شاید یہ انصار الشریعہ ہوگی) نے بن غازی میں امریکی قونصلیٹ پر حملہ کر دیا اور تین دیگر امریکی شہریوں کے ساتھ امریکی سفیر کو قتل کر دیا۔ کسی قدر امریکی حمایت کے ساتھ لیبیا کی حکومت کو علاقے کا قبضہ واپس لینے میں گھنٹے لگے۔ بن غازی حملے سے سخت ترین انداز میں یہ واضح پیغام ملا کہ کسی قابل استعمال ریاست کے بغیر انسانی حقوق، امن و امان، مربوط جمہوریت یا مؤثر حکمرانی کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔

بشار الاسد کے زیر حکومت شام، سلطان ازم کی مضبوط خصوصیات کا حامل ہے جیسا کہ ''خاندانی'' عنصر۔ اسے صدارت اپنے والد سے وراثت میں ملی۔ اس وقت تک شام اتنا سلطانی نہیں تھا جتنا کہ لیبیا - کاروباری طبقے کو کچھ حصے اور ریاستی عناصر کو کم از کم کچھ داخلی خود مختاری حاصل تھی۔ سلامتی سے متعلق حکام پوری طرح کنٹرول میں تھے۔ اس کا کوئی بھی سکیورٹی اہل کار ایسا نہ تھا جس پر اس کا مکمل ذاتی اعتماد نہ ہو۔ جس کا مطلب تھا کہ ان سب کا تعلق لازماً علوی مذہبی اقلیت سے تھا۔ علوی غلبے کا تشدد آمیز چہرہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہم یہاں مارکوس یا مبارک کا علاقہ نہیں ہیں، جہاں منظم فوج حکمران کو برطرف کر دے۔ علوی آفیسرز اس بات سے واقف تھے کہ اگر اسد کی حکومت کا خاتمہ ہوتا ہے تو وہ سب اور ان کے خاندانوں کو ہلاکت خیز خطرے کا سامنا ہوگا۔ شام میں کوئی بااثر حکومت اور نرم خو حزبِ مخالف نہیں جو سلطان کی حکومت کے خاتمے کی میعاد پوری ہونے پر نیم سرکاری مذاکرات کر سکیں۔ بیرونی امداد کے ساتھ مختلف محاذوں اور جنگجو دھڑوں کے مابین خانہ جنگی جاری ہے۔ ہمیں کسی ایسی صورتِ حال کا نہیں پتہ جب ایک طویل، پیچیدہ اور وحشیانہ خانہ جنگی نے ہم آہنگ ریاست اور تیزی سے ابھرتی ہوئی جمہوریت کی طرف رہنمائی کی ہو۔

مبارک کے مصر میں سلطان ازم کی شروعات بشمول ''شدید کرپشن'' گمل مبارک کی بطور اپنے والد کے جانشین کے تیاری کے ذریعے ہو رہی تھیں۔ پھر بھی مصری فوج نے (لیبیا، شام یا یمن میں اپنے ہم منصبوں کے برعکس) اداراتی خود مختاری کی اچھی مثال قائم رکھی۔ مصری فوج بآسانی اس قابل

تھی کہ وہ فی الفور اور پُرامن طور پر ضعیف العمر مبارک کو اقتدار سے الگ کر کے اور اندرونی طور پر اسے جلاوطن کر کے اپنے مفادات کی حفاظت کر سکے۔ اب جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ فوج بطور ادارہ کا اگلا ہدف مکمل جمہوریت بن گیا ہے۔

تیونس میں سب سے زیادہ سلطانی خصوصیت اس کا اپنی بیوی اور اس کے خاندان کو اس بات کی کھلی اجازت دینا تھا کہ وہ تیونس کی معیشت کو اپنی ذاتی جائیداد سمجھیں۔ پھر بھی بن علی کے جابرانہ نظام کی شکل ایک ایسے زیرِ زمین (یا جلاوطن) سیاسی معاشرے کو نہیں روک سکی جس میں تمام بڑی حزب مخالف قوتوں کے وجود میں آنے اور بن علی کے بعد کے تیونس سے متعلق گفت وشنید کا موقع ملے۔ لہٰذا جب اس کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو نسبتاً ایک معقول اور جمہوری متبادل موجود تھا۔ ایک اہم وجہ یہ تھی کہ بن علی نے اپنے غلط کاموں کے لیے پولیس کو استعمال کیا تھا اور تیونس کی چھوٹی سی فوج کو پیشہ ورانہ رہنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس بات نے ''فوج بطور ادارہ'' کو اس قابل بنا دیا کہ اس نے آمریت کے فوری اور غیر متشدد خاتمے کے لیے بنیادی کردار ادا کیا۔ فوج نے پولیس کو بن علی کی حفاظت کی خاطر مہلک طاقت کے استعمال سے روکا اور اس نے سلطان پر واضح کیا کہ فوجی جوان اسے احتجاج کرنے والوں سے تحفظ فراہم نہیں کریں گے لیکن اگر وہ فی الفور جانا چاہے تو اسے سعودی عرب جانے کے لیے محفوظ راستہ دینے کی یقین دہانی کرائیں گے۔ بن علی نے اس پیش کش پر عمل کا دانشمندانہ فیصلہ کیا۔ پھر فوج، جو کہ چند خصوصی استحقاق پر تحفظات کے ساتھ ایک معقول ادارہ تھا، نے مصری طرز پر اپنی طاقت اور ضروریات کی حفاظت جیسی پریشانیوں میں پڑنے کی بجائے جمہوری طور پر انتقالِ اقتدار کو محور بنا لیا۔

نہ تو ۱۹۵۶ء کا ہنگری کا انقلاب، ۱۹۶۸ء کا پریگ سپرنگ اور نہ ہی ۱۹۸۱ء میں پولینڈ کی یکجہتی فوری طور پر جمہوریت تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئے۔ پھر بھی ان میں سے ہر ایک تاریخی تحریک تھی جس نے ہمیشہ کے لیے چیلنج کرنے والی آمرانہ حکومتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عرب بہار کے واقعات نے عرب کے ''تاحیات صدور'' کو تیزی سے نامقبول اور شہریوں کی عظمت کو تیزی

سے مطلوب بنا دیا ہے۔

[الفریڈ سٹیفن، پروفیسر آف گورنمنٹ اور کولمبیا یونیورسٹی کے مطالعاتی مرکز برائے جمہوریت، برداشت اور مذاہب کے بانی ڈائریکٹر ہیں۔ جوان جے لنز، ییل (Yale) یونیورسٹی میں سیاسی و سماجی سائنس کے پروفیسر ایمریطس ہیں۔]

(ترجمہ و تلخیص: منزہ صدیقی)

Source: Alfred Stephan and Juan J. Linz, "Democratization Theory and The Arab Spring" *Journal of Democracy*, Volume 24, Number 2. April 2013.

حواشی

1. Alfred Stepan, "Religion, Democracy, and the 'Twin Tolerations' ", *Journal of Democracy* 11 (October 2000): 37–57.

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:

Alfred Stepan, "The World's Religious Systems and Democracy: Crafting the 'Twin Tolerations' ", *Arguing Comparative Politics* (Oxford: Oxford University Press, 2001), 213–54.

2. Alfred Stepan, "The Multiple Secularisms of Modern Democratic and Non-Democratic Regimes", in Craig Calhoun, Mark Juergensmeyer, and Jonathan VanAntwerpen, eds., *Rethinking Secularism* (New York: Oxford University Press, 2011), 114–44.

۳۔ دیکھیے:

Alfred Stepan, Juan J. Linz, and Yogendra Yadav, *Crafting State Nations: India and Other Multinational Democracies* (Baltimore: Johns Hopkins University Press, 2011), 70–71.

4. Mirjam Künkler and Alfred Stepan, "An Interview with Amien Rais," *Journal of*

International Affairs 61 (Fall–Winter 2007): 205–18.

5. Stepan, "The Multiple Secularisms of Modern Democratic and Non-Democratic Regimes." 117.

6. Alfred Stepan, "Tunisia's Transition and the Twin Tolerations," *Journal of Democracy* 23 (April 2012): 94–97.

7. Jonathan Hartlyn, "The Trujillo Regime in the Dominican Republic," in H.E. Chehabi and Juan J. Linz, eds., *Sultanistic Regimes* (Baltimore: Johns Hopkins University Press, 1998), 97.

۸۔ اس امتیاز کی سیاسی اہمیت ملاحظہ کرنے کے لیے دیکھیے:

"The Military as Institution Versus the Military as Government," in Alfred Stepan. *The Military in Politics: Changing Patterns in Brazil* (Princeton: Princeton University Press. 1971), 253–66.

۹۔ دیکھیے:

"Politics as Vocation" in H. H. Gerth and C. Wright Mills, eds., *From Max Weber: Essays in Sociology* (New York: Oxford University Press. 1946). 78. Emphasis in original.